رشید اختر ندوی، رومان، تاریخ اور تحقیق

ڈاکٹر شاہد اقبال کامران

بیسویں صدی کی دوسری دہائی سے لیکر آخری دہائی تک کا دور برصغیر میں بسنے والے مسلمانوں کے لیے متعدد وجوہ کی بنا پر بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس میں سے بھی نصف اول، کہ جس میں مسلمانان برصغیر کو اپنے جداگانہ تشخص کے تحفظ کے لیے ایک خاص سیاسی موقف تک پہنچتے ہوئے فیصلہ کن جدوجہد کرنا پڑی، حد درجہ محتاط مطالعے اور تجزیے کا متقاضی ہے۔ یہی دور پاکستان کے ممتاز دانشور، اردو کے محبوب ناول نگار، منفرد مورخ، مفکر، سوانح نگار اور مترجم رشید اختر ندوی کا عرصہ حیات بھی ہے (1913ء۔1992ء) جس سیاسی، مذہبی معاشی اور معاشرتی ماحول میں رشید اختر ندوی نے آنکھیں کھولیں، وہ فکر و نظر کے تین واضح دھاروں میں منقسم تھا۔ ایک نہایت قدیم اور تبدیل شدہ صورت حال اور اس کے اثرات کو قبول کرنے سے بے زار، دوسرا تبدیل شدہ صورتحال کی تخلیق اور خود کو بدلتے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے بے چین۔ ایک دوسرے سے یکساں بے زاری اور نظریاتی بُعد ان دونوں طبقات کی واحد قدر مشترک تھی۔ تیسرا طبقہ ''متعدل فکر و نظر'' رکھتا تھا۔ معتدل فکر و نظر کی ترکیب مولانا ابوالکلام آزاد نے ترکی کی صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے وضع کی تھی اور شیخ محمد اکرام نے 'موج کوثر' میں اسے حوالہ بنایا ہے۔(1) دراصل اس سے ایسا رجحان مراد ہے جو نہ تو نہایت قدیم کی طرح تقلید کا شکار ہو اور نہ ہی نہایت جدید کی طرح مغرب زدگی کا شکار، اس رجحان کا حاصل یہ شعور ہے کہ اپنی دینی اساس سے وابستہ رہتے ہوئے بھی جدید تغیرات کی خوبیاں اپنائی جاسکتی ہیں نیز یہ کہ علم کا کوئی مذہب اور کوئی مخصوص زبان نہیں ہوتی ہاں البتہ جن مذاہب کے ماننے والے علم سے دور ہو جائیں وہ عملاً زندگی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ ہماری تاریخ کے اس فیصلہ کن دور میں، مقام شکر ہے کہ عامتہ الناس نے دو نظریاتی انتہاؤں کے درمیان وسط اور اعتدال کے موقف کو پذیرائی بخشی۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے اواخر میں رشید اختر ندوۃ العلماء لکھنو میں زیر تعلیم تھے، ملک میں سیاسی حالات و واقعات کی رفتار تیز سے تیز تر ہو رہی تھی، گول میز کانفرنسوں کا سلسلہ شروع ہوا تھا اور ادھر الہٰ آباد میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں خطبہ صدارت دیتے ہوئے اقبال اپنے وقیع استدلال کو یوں سمیٹ رہے تھے کہ:

> ہندوستان کی سیاسی غلامی تمام ایشیا کے لیے لامتناہی مصائب کا سرچشمہ ہے اس نے مشرق کی روح کو کچل ڈالا ہے اور اسے اظہار ذات کی اس مسرت سے محروم کر دیا ہے جس کی بدولت کبھی اس میں ایک بلند اور شاندار تمدن پیدا ہوا تھا...... مادیات سے گزر کر روحانیات میں قدم رکھیے۔ مادہ کثرت ہے لیکن روح نور ہے، حیات ہے، وحدت ہے ایک سبق جو میں نے تاریخ اسلام سے سیکھا ہے، یہ ہے کہ آڑے وقتوں میں اسلام ہی نے مسلمانوں کی زندگی کو قائم رکھا، مسلمانوں نے اسلام کی حفاظت نہیں کی۔ اگر آج آپ اپنی نگاہیں

پھر اسلام پر جمادیں اور اس کے زندگی بخش تخیل سے متاثر ہوں تو آپ کی منتشر اور پراگندہ قوتیں از سرِ نو جمع ہو جائیں گی اور آپ کا وجود ہلاکت و بربادی سے محفوظ ہو جائے گا۔(2)

خطبہ الہٰ آباد کے اس طویل اقتباس کو پیش کرنے کا مقصد اُس پس منظر کی تصویر کشی ہے جن میں رشید اختر ندوی اپنا کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ظاہر بات ہے کہ ندوۃ العلماء مسلم لیگ کی سیاست یا اقبال کے نظریات سے الگ تھا۔سیاسی اور ملکی معاملات سے علیحدہ رہنا ندوہ کے اساسی مقاصد میں سے ایک تھا۔(3) لیکن چاہے تو غیر شعوری طور پر ہی سہی ،رشید اختر ندوی کی علمی خدمات کی جہت اور دائرہ یہ باور کراتا ہے کہ وہ اقبال کی اس آواز کے ایک بامعانی مخاطب تھے۔رشید اختر ندوی نے اگلی نصف صدی میں جس نہج پر علمی کام کیا، اسے اقبال کے اس تجزیے سے وابستہ کیا جاسکتا ہے۔

تعلیم کے لیے علی گڑھ کی بجائے ندوۃ کی طرف رجوع، میرے نزدیک رشید اختر ندوی کی والدہ محترمہ سیدہ غلام فاطمہ کے رجحان کے باعث ہوا۔ندوۃ کی تعلیم و تربیت کا سب سے بڑا اثر تو ان کے نام میں نظر آتا ہے کہ اسی نسبت سے رشید اختر ، ہمیشہ کے لیے ندوی ہوگئے۔شروع میں رشید اختر کو ''مولانا'' بھی خیال کیا گیا،لکھا بھی گیا کہ مولوی یا مولانا کا ایک مطلب پڑھا لکھا ہونا بھی ہوتا تھا،لیکن طبعاً رشید اختر ایک جدید ذہن اور متحرک طبیعت کے مالک تھے اور مولانا عبدالمجید سالک کے مطابق

مصنف ندوۃ العلماء کا مولوی ہی نہیں بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہے۔(4)

رشید اختر ندوی کی علمی شخصیت میں ندوۃ العلماء کے مولوی سے ''کچھ زیادہ ہونا'' ہی سب سے بڑی صفت اور خوبی دکھائی دیتی ہے اور اس خوبی یا صفت کو جامعہ ملیہ دہلی ،خاص طور پر ڈاکٹر ذاکر حسین کی سحر انگیز شخصیت نے دوچند کر دیا۔ندوۃ کے مولوی اور جدید مغربی علمی و تحقیقی طرزِ فکر کے مابین اصل کڑی ڈاکٹر ذاکر حسین کی شخصیت اور تربیت ہے۔ندوۃ اور شبلی نعمانی کے جو معاملات بھی رہے ہوں، شبلی کی شخصیت کے علمی پہلو نے ندوہ کی صورت گری میں اپنا کردار ضرور ادا کیا۔شبلی علی گڑھ اور ندوۃ کی درمیانی کڑی تو نہ تھے لیکن ان دو انتہاؤں کے مشاہد ضرور تھے۔ان کی ایک حیثیت علمی مورخ کی بھی تھی۔ برصغیر میں اسلامی تاریخ نگاری کا بنیادی مقصد مسلمانانِ برصغیر کی ذہنی زندگی کو ایک نیا اور توانا پس منظر فراہم کرنا یعنی اُس خلا کو پُر کرنا ہے جو تبدیلی مذہب کے باعث پیدا ہوتا ہے۔عمومی طور پر برصغیر کی اسلامی تاریخ نگاری کو اسی تناظر میں سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

رشید اختر ندوی شبلی نعمانی سے اثر پذیر تو ضرور ہوئے لیکن ان کے تاریخی شعور کو ندوۃ کے ماحول اور تربیت سے زیادہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی تعلیم اور شخصیت نے مرتب کیا ہے۔رشید اختر ندوی کی دوسری مادرِ علمی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی ہے۔1920ء میں علی گڑھ میں قائم ہونے والے اس آزاد تعلیمی ادارے سے علی گڑھ کے ہونہار ذاکر حسین ابتدا ہی سے وابستہ ہوگئے تھے۔1922ء میں ذاکر حسین معاشیات کی اعلیٰ تعلیم کے لیے جرمنی چلے گئے۔1926ء میں تعلیم مکمل کر کے واپس آنے والے تھے کہ خبر ملی کہ جامعہ کو بند کرنے کے مشورے ہو رہے ہیں، ڈاکٹر ذاکر حسین نے جرمنی سے بذریعہ تار اطلاع دی کہ وہ اور ان کے ساتھی خود کو جامعہ کے لیے وقف کرنے کی قسم

کھا چکے ہیں لہٰذا جامعہ کو بند نہ کیا جائے۔(5) ڈاکٹر ذاکر حسین واپس آ گئے جامعہ کے وائس چانسلر ہوئے لیکن ایسے وائس چانسلر کہ بائیس سال تک برائے نام تنخواہ پر کام کرتے رہے۔اسے رشید اختر ندوی کی خوش بختی خیال کرنا چاہیے کہ انہیں جامعہ میں ڈاکٹر ذاکر حسین سے پڑھنے اور سیکھنے کا موقع ملا۔ڈاکٹر ذاکر حسین نے رشید اختر ندوی کو تاریخ پڑھائی۔(6) اور یوں رشید اختر ندوی کو تاریخ خوانی اور تاریخ نگاری کے نئے شعور سے روشناس کرایا۔ڈاکٹر ذاکر حسین فلسفے کی سرزمین جرمنی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آئے تھے۔ان کی صحبت نے رشید اختر ندوی کی شخصیت میں پنہاں تاریخی رجحان کو نکھار دیا۔اقبال اپنے ایک خطبے میں لکھتے ہیں کہ :

> مغرب کے لوگوں کی ذہنی افتاد تاریخی ہے۔ان کی زندگی اور ان کا وجود وقت میں پوشیدہ ہے مشرقی لوگوں کا آفاقی شعور غیر تاریخی ہے۔مغربی آدمی کے لیے ہر چیز کا ماضی، حال اور مستقبل ہوتا ہے۔مشرقی آدمی کے لیے ان کا وجود بلا قید زمان قائم ہوتا ہے۔(7)

رشید اختر ندوی ایک دانشور کے طور پر اور تاریخی رجحان یا افتاد کے اعتبار سے مغربی آدمی معلوم ہوتے ہیں ان کی فکری و فنی زندگی کی اساس ''وقت'' ہے۔ان کے ایک سوانح نگار نے انہیں ایک ''زود نویس ادیب'' لکھا ہے۔(8) جس چیز کو سوانح نگار زود نویسی قرار دے رہا ہے وہ دراصل ''وقت'' کا شدید احساس اور ''وقت'' کی عمل کاری کا گہرا ادراک ہے۔رشید اختر ندوی کے ادبی خزانے اور علمی سرمایے کو دیکھ کر اس اضطراب کو محسوس کیا جا سکتا ہے جو وقت کے ہم رکاب چلنے اور پھر اس سے آگے نکل جانے کی شدید خواہش کے باعث پیدا ہوتا ہے۔رشید اختر ندوی لکھنو میں کچھ عرصے رہنے کے باوجود عجز اور انکسار کے اظہار کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔

صلاح الدین ایوبی کے حرف اول کے آخر میں لکھتے ہیں:

> یہ کتاب اُس اونچے تاجدار کی روح کے حضور اس دور کے ایک گناہ گار مصنف کی طرف سے ایک حقیر نذرانہ ہے۔(9)

اپنی معرکہ آرا تالیف 'مسلمان حکمران' کے طویل انتساب میں لکھتے ہیں کہ :

> میں ایک ناچیز مصنف ہوں۔میرے ذرائع بہت محدود ہیں۔(10)

اسلام میں مرکزی حکومت کا تصور اور اس کی معاشی ذمہ داریاں ، کے حرف آغاز میں وجہ تالیف بڑھاپے میں مکافات عمل قرار دے کر اپنے رب اور اپنی ملت اپنے گزشتہ گناہوں اور خطاؤں کی معافی چاہتے ہیں۔(11) اس طرح کے عجز اور اس درجہ انکسار کی بنیادی وجہ وقت کا احساس ہے۔ہمارے ادب میں شاعرانہ تعلّی کے رجحان اور روایت کی واحد نفسیاتی وجہ ہمارے شعرا کے ہاں زمان اور اس کے متعلقات کا عدم شعور ہے۔ہمارے شعرا و ادبا اپنے غیر تاریخی شعور میں اپنی ذات کو مرکز بنا کر اس کے بے ثبات ہونے کے احساس کو محو کرنا چاہتے اور خود اپنی عظمت کے بے معنی احساس کا شکار ہو جاتے ہیں۔رشید اختر ندوی، ایک ادیب اور ایک مورخ کے طور پر جانتے تھے کہ ماضی، حال اور مستقبل وقت کے تین علیحدہ حصے نہیں ہیں، بلکہ وقت کی تین کیفیتیں ہیں، یہ تین کیفیات باہم منسلک، متصل اور مسلسل ہیں۔ان کی تفہیم یا شعور حاصل کرنے کے لیے معروضی انداز نظر کے سوا کوئی منہاج قابل اعتبار نہیں۔معروضیت رشید اختر ندوی کے تحقیق

اسلوب کی بنیاد ہے۔ یہی معروضیت اپنی تاریخ میں سے اپنے لوگوں کے لیے نئے ہیرو تلاش کرنے والے رشید اختر ندوی کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے لوگوں کے دلوں میں سجے بعض پرانے بتوں کو پاش پاش بھی کر دے جیسے کہ مغل اعظم شہنشاہ اکبر کے منہ پر قلم کی سیاہی مل کر (12) یا ابوالعباس اور ابوجعفر منصور کو ہدف ملامت بنا کر (13) رشید اختر ندوی نے تاریخی بت شکنی کا مظاہرہ کیا ہے۔

1933ء میں جامعہ ملیہ دہلی سے گریجویشن کرنے کے بعد رشید اختر ندوی عملی زندگی میں قدم رکھتے ہیں۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہنی چاہیے کہ جامعہ ملیہ کے جملہ مقاصد میں ایک یہ بھی تھا کہ علی گڑھ کی تعلیم کے حصول ملازمت سرکار انگلیشیہ کے حد سے بڑھے ہوئے شوق کو جو عملاً تعلیم و تربیت کے آزادانہ اور تخلیقی جوہر کچل کے رکھ دیتا ہے، ختم کیا جائے یا کم کیا جائے۔

جامعہ ملیہ کی اس روش کا اثر کہنا چاہیے یا مزاج کی آزادروی کہ رشید اختر ندوی کبھی ملازمت کے شدید آرزومند نہ ہوئے، جامعہ سے گریجویشن کرنے کے بعد روزگار کا مرحلہ درپیش ہوا اس دور کا فیضؔ احمد فیض نے بڑا ابلیغ نقشہ کھینچا ہے۔ دستِ تہہ سنگ کے حروف آغاز بعنوان فیض از فیض، میں لکھتے ہیں:

> ۔۔۔۔پھر دیس میں عالمی کساد بازاری کے سائے ڈھلنے شروع ہوئے کالج کے بڑے بڑے
> بانکے تیس مارخان تلاش معاش میں گلیوں کی خاک پھانکنے لگے یہ وہ دن تھے جب یکا یک بچوں کی ہنسی بجھ گئی۔
> اجڑے ہوئے کسان کھیت کھلیان چھوڑ کر شہروں میں مزدوری کرنے لگے اور۔۔۔(14)

ایسے میں نوجوان رشید اختر ندوی عملی زندگی میں داخل ہوئے۔ چونکہ وہ بڑے بانکے تیس مارخان نہیں تھے، اس لیے انہیں تلاش معاش کے لیے گلیوں کی خاک نہ پھانکنی پڑی، والدہ کی محتاط اور متوجہ تربیت اور جامعہ ملیہ کی کردار سازی نے انہیں احساسِ ذات اور خودداری کی دولت سے مالا مال کیا تھا۔ جامعہ کے فارغ التحصیل سرکاری ملازمتوں کے دیوانے نہیں ہوتے تھے۔ زندگی میں جو کچھ پڑھا اور سیکھا تھا اسے اپنی خداداد صلاحیتوں کے ساتھ ملا کر قلم ہاتھ میں پکڑا اور بطور صحافی میدان میں اترے۔ اُس وقت بھی لاہور اردو صحافت کا ایک بڑا مرکز تھا۔ اُس دور میں نوجوان قلم کار کو لاہور، دہلی، بمبئی اور پشاور کے سفر اختیار کرنے پڑے کہ یہ سارے شہر ایک ہی ملک کا حصہ تھے۔ کچھ یہی دور ہے جب رشید اختر ندوی کے مشاہدات کہانیوں کی صورت اختیار کرنے لگے۔ اب یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اردو والے طبعًا اور مزاجاً ’غزل‘ کے لوگ ہوتے تھے۔ پانچ سات شعروں میں ابلاغ مکمل، سر دھننے اور تغزّل کا مزا لیجے، ہر طرح کے تجربے اور مشاہدے کو اسی میں سمیٹ دیجئے۔ ناول پڑھنے کی زحمت کون کرے، ناول یا طویل کہانی کو پڑھنے کے لیے جو طبیعت، جو مزاج، جو ٹھہراؤ درکار ہوتا ہے۔ وہ یہاں مفقود تھا شاید اب بھی ہے، طبیعت تفصیل پسند نہیں، کون کہانی کے مکمل ہونے کا انتظار کرے، پلاٹ، کردار، اندرونی نظم اور تسلسل، زمان اور مکان کے جھمیلوں کو کون ایک وحدت یا اکائی کی صورت سمجھنے کی کوشش کرے، کچھ اس قسم کی وجوہ ہوں گی کہ اردو ناول اپنے بے پناہ امکانات کے باوجود اپنے دیوانے پیدا نہیں کر سکا۔ ناول کے ایسے دیوانے پورے سماجی ماحول اور اجتماعی ذہنی سطح میں ترقی اور تبدیلی کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتے۔ فیض احمد فیض اسی عہد یعنی بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کے اوائل میں ’اردو ناول‘ کے زیر عنوان ایک

مضمون میں لکھتے ہیں کہ :

> ناول کے پنپنے کے لیے کسی تک ہمارے سماجی ماحول کا بدلنا ضروری ہے۔ ناول پڑھنے کے لیے اور لکھنے کے لیے کافی فرصت چاہیے۔ یہ ضروری ہے کہ پڑھنے والوں کا ایک معقول طبقہ ایسا ہو جو ناولوں کی ورق گردانی میں وقت صرف کر سکے اور لکھنے والوں کے پاس اتنی فرصت ہو کہ وہ اطمینان سے اپنا کام کر سکیں۔آج کل یہ دونوں باتیں بہت حد تک مفقود ہیں۔(15)

اس کے باوجود ناول کو اظہار کا ذریعہ بنانا نوجوان رشید اختر کے اس بے پناہ اعتماد اور عزم کو ظاہر کرتا ہے، جو در حقیقت اس کی اصل طاقت اور حقیقی سرمایہ تھا، ساز شکستہ (1941ء) کے نوجوان مولانا رشید اختر ندوی سے لیکر اس نے محبت کی، (1951ء) کے صرف رشید اختر ندوی تک سترہ ناول لکھے گئے (16) برصغیر کے حوالے سے کسی حد تک کہہ سکتے ہیں کہ بیسویں صدی کا نصف اول ناول کا دور بھی رہا۔ رومانوی ناول پڑھی لکھی خواتین میں بطور خاص مقبول ہوتے۔ میرا تاثر یہ ہے کہ رشید اختر ندوی کی ناول نگاری کا یہ دور، اظہار ذات کی مسرت سے لبریز ہے۔اسی ناول نگاری نے ان کی شہرت اور محبوبیت کو برصغیر کے کونے کونے تک پہنچا دیا۔ کچھ سید زادہ ہونے کی خصوصی رعایتیں اور کچھ کشش کا وہ طلسم جو ہر کامیاب اور بامراد آدمی کی شخصیت کا حصہ بن جاتا ہے، رشید اختر ندوی کو ہر قسم کے حجاب سے بے نیاز کر گیا۔ تشنگی شروع کے ناولوں میں سے ایک ہے یہ ناول بقول مصنف:

> اس آوارہ خرام و آوارہ مزاج مصنف نے بمبئی میں بیٹھ کر لکھا اور اس وقت لکھا جب وہ سماج و مذہب کے ہر بندھن سے خود کو آزاد سمجھتا تھا۔ وہ صرف ایک مذہب پر ایمان رکھتا تھا اور وہ مذہب انسانیت و شرافت کا مذہب تھا۔ جب اس کے نزدیک آدمی ہندو تھا نہ مسلمان، آدمی محض آدم کا بیٹا تھا(17)

یہ ناول غلام ہندوستان کے جس دور کی عکاسی کر رہا ہے اس میں آنکھیں کم تھیں اور خواب زیادہ، ناول کا ہیرو ناول نگار کا اپنا ہمزاد معلوم ہوتا ہے رشید اختر ندوی تشنگی کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ :

> یہ ناول اس وقت کی تصنیف ہے جب ہندوستان غلام تھا اور انگریزوں کے جابر و ظالم پنجہ نے ہندوستانیوں کے گلے گھونٹ رکھے تھے، اس وقت میری بے چین روح ایک ایسے سماج اور ایک ایسے نظام کے لیے تڑپی جس میں آدمی ہندو ہوتا نہ مسلمان، نہ پارسی ہوتا نہ عیسائی۔(18)

اس ناول کے مرکزی کرداروں کے بارے میں مصنف وضاحت کرتا ہے کہ

> سب کا مذہب ننگے آدم کا مذہب تھا، سب کے نام گو مختلف تھے، مگر سب کا عقیدہ ایک تھا، آدمی صرف آدمی رہے اور آدمی رہ کر ہی اپنا منصب پہنچانے۔(19)

تشنگی رشید اختر ندوی کا وہ رومان تھا جو انہیں ہمیشہ عزیز رہا۔ اس ناول کا خواب اور خیال اس عہد کے دانشور طبقے کا خواب اور خیال ہے۔ اس خواب اور خیال کے پونے چار سو صفحے پڑھ جائیے، ناول نگار کا خلوص اور درد اور سچائی حد درجہ نمایاں نظر آتی ہے۔ یہ ناول اپنے عہد اور رشید اختر ندوی کے ذہن کی بھرپور نمائندگی کرتا نظر آتا ہے۔ رومانی ناول نگاری کے اس عہد کو ناول نگار رشید اختر کی تخلیقی زندگی

کا حسین ترین دور کہا جاسکتا ہے۔ اواخر عمر میں جب انہوں نے اپنا شہکار ناول ''الجھی راہیں'' لکھ کر اپنی تخلیقی زندگی کے عہد زریں کو یاد کیا تو ان کی آنکھوں میں تیز ترین چمک اور ہونٹوں پر شرینی کے احساس کو صاف محسوس کیا جاسکتا تھا۔ ''الجھی راہیں'' کے حرف اول کے آخر میں لکھتے ہیں کہ :

> ۔۔۔۔ میں سمجھتا ہوں اور مجھے فخر ہے کہ میں نے آنکھیں بند کرنے سے پہلے، اپنے اس شُغل کی تجدید کر کے بڑا اچھا کام کیا ہے جس سے میری ادبی زندگی کا آغاز ہوا اور جس سے مجھے بڑا فیض پہنچا ہے، میں نے عزت وشہرت بھی پائی اور مالی منفعت بھی حاصل کی۔ اگر میں نے ناول نویسی نہ کی ہوتی، تو میں اس وقت وہ نہ ہوتا جو میں ہوں۔ میری طرف سے میرا یہ ناول میری جوانی کے دور کی ناول نویسی کے حضور، خراج ہے۔(20)

میرا تاثر یہ ہے کہ رشید اختر ندوی کی مقبول اور محبوب رومانوی ناول نگاری ان کی محترمہ والدہ کے مزاج اور ترجیحات سے مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ انہوں رشید اختر کی تعلیم وتربیت ایک خاص نہج پر کی تھی اور چاہتی تھیں کہ رشید اختر ''جُھوٹی کہانیاں'' لکھنے کی بجائے کوئی مفید کام کریں۔ ندوۃ کی تعلیم سے زیادہ والدہ محترمہ کی تربیت اور ڈاکٹر ذاکر حسین کی نظر کا فیضان ہے کہ قیام پاکستان کے چند برس بعد انہوں نے رومانی ناول نگاری سے گریز کرتے ہوئے تاریخی ناول نگاری کی طرف توجہ کی۔ اس عنوان میں سات تاریخی ناول ان سے یادگار (21) ہیں۔ قیام پاکستان سے مسلمانوں کے لیے ایک جداگانہ وطن تو بن گیا لیکن پاکستانی قوم کی تعمیر وتشکیل کا کام باقی تھا، تو اسی تناظر میں تاریخی ناول نگاری کے ایک پورے عہد نے جنم لیا۔ یہ نو آزاد مسلمانانِ پاکستان کی توجہ ان کے شاندار ماضی کی طرف مبذول کرانے کی ایک منظّم کوشش خیال کی جاسکتی ہے۔ رشید اختر ندوی کی ناول نگاری کی اساس ان کا تاریخی رومان اور تحقیقی رجحان ہے۔

تاریخی ناول نگاری سے متصل عہد تحقیق وتاریخ کے مطالعات کا ہے، اسی دور میں رشید اختر ندوی کے ہاں اس سوال نے پرورش پانی شروع کی کہ مسلمانان برصغیر اور مسلمانان پاکستان کی جملہ تاریخ کا تعلق اس جغرافیے سے کیوں نہیں جس سے کہ وہ تعلق رکھتے ہیں۔ ایسی بات نہیں کہ وہ انسان کی نظریاتی ولادت نو کے تصور سے بے خبر تھے لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ وہ نظریاتی ولادت نو کو انسان کے اصل ماضی اور پس منظر سے متصادم خیال نہیں کرتے تھے۔ جو انفرادیت پہچان کا عنوان ہے اس سے گریز کیوں؟ رشید اختر ندوی کو تاریخ نگاری نے اس سوال کا جواب دینے کی کافی وشافی کوشش کی ہے تاریخ مغربی پاکستان، شمالی پاکستان، ارض پاک کا قدیم رسم الخط اور زبان اور ارض پاکستان کی تاریخ اس سلسلے کی کڑیاں خیال کی جاسکتی ہیں۔ تاریخ اور تاریخی صداقت کے حوالے سے پاکستان میں، بدقسمتی سے صورت حال حوصلہ افزا نہیں رہی۔ ہم نے سوچنے سمجھنے کا کام اور نظریاتی رہنمائی کا حق ان طبقات کے حوالے کر دیا جو پاکستان کے تصور اور قیام پاکستان کی تحریک اور جدوجہد سے بالکل الگ اور متحارب رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قیام پاکستان کے فوری بعد ہماری آئین ساز اسمبلی ایک جمہوری فلاحی ریاست کا آئین بنانے کی بجائے صرف قرارداد مقاصد منظور کر سکی اور آئین سازی کا کام معلق رہا۔ تا آنکہ 1973ء میں ایک متفقہ آئین بن پایا۔ کچھ اسی طرح کی وجوہ کی بنا پر پاکستان میں تاریخ نویسی

اور تاریخ شناسی کی بجائے ''تاریخ تراشی'' کے فن کی حوصلہ افزائی کی گئی۔ جہاں تاریخ تراشی کی جارہی ہو وہاں صداقت کی بنیاد پر کی جانے والی تاریخ نویسی کو شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس حوالے سے رشید اختر ندوی کی تاریخ شناسی کا مطالعہ اس موضوع پر ایک منفرد دستاویز بن سکتا ہے۔ رشید اختر ندوی امر واقعہ سے ڈرنے اور خوفزدہ ہونے والے مورخ نہیں تھے۔ وہ اس اصول سے باخبر تھے کہ تاریخی واقعات اور حقائق میں تحریف کی بجائے، ان کا درست اور معروضی تجزیہ ہی اس دانش کا موجب بن سکتا ہے جس کی وجہ سے تاریخ کو علم کا ایک اہم ماٰخذ قرار دیا گیا۔ لیکن پاکستان میں کھل کھیلنے اور ''گل کھلانے'' والی طاقتوں کے لیے عامتہ الناس کی آنکھوں پر پٹی باندھے رکھنا نہایت ضروری تھا۔ کچھ یہی وجہ ہے کہ رشید اختر ندوی کی تاریخ نویسی کو بسا اوقات شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن کسی قسم کی پابندی، کسی کتاب کی ضبطی یا کسی صداقت یا علمی موقف کی مزاحمت رشید اختر ندوی کو اپنے راستے سے ہٹا نہ سکی۔

بطور مورخ مستقل بینی کا ایک خاص شعور رشید اختر ندوی کے ہاں پیدا ہو گیا تھا۔ ایسا شعور تاریخی عمل کو ایک وحدت یا اکائی کی صورت سمجھنے ہی سے پیدا ہو سکتا ہے۔ 'شمالی پاکستان' کے عنوان سے پاکستان کے شمالی علاقوں کی تاریخ اور ان علاقوں کی اطراف و جوانب کے ممالک کے لیے سیاسی اہمیت کا بہترین تجزیہ پیش کرنے والی تالیف اس کی عمدہ مثال ہے۔ رشید اختر ندوی شمالی پاکستان کے حرف آغاز میں لکھتے ہیں:

> تقسیم کے وقت نہ پاکستان کے سیاست دانوں کو معلوم تھا اور نہ ہندوستان کے نیتاؤں کو اس کی خبر تھی کہ ان کے ہمسایہ میں واقع یہ ملک جن میں سے ایک کا نام روس ہے اور دوسرے کا نام چین، ان کے ایسے ہمسائے بن جائیں گے جیسے ہندوستان کا نیپال اور پاکستان کا افغانستان ہے اور ان کی مرضی ان کی سیاست پر اس قدر اثر انداز ہوگی کہ انہیں ہر قدم اٹھانے سے پہلے سوچنا پڑے گا کہ کہیں ان کے اقدام سے ان کے یہ دو بڑے ہمسائے ناراض نہ ہو جائیں اور ان کے لیے جینا مشکل کر دیں۔(22)

کم از کم پاکستان کی حد تک رشید اختر ندوی کا یہ خدشہ درست ثابت ہوا ہے۔ ہم پاکستانیوں نے شمالی علاقوں کی حقیقی اہمیت، معدنی افادیت، جغرافیائی معنویت اور سیاسی حساسیت کو نظر انداز کیا ہے میں اس صورت حال پر تبصرہ کرنے کی بجائے رشید اختر ندوی کا مشورہ پیش کرنے پر اکتفا کروں گا، لکھتے ہیں:

> ۔۔۔۔کسی بھی حکومت پر جو بھی پاکستان میں برسر اقتدار آئے، اس شمالی علاقے کی دیکھ بھال ویسی ہی ضروری ہے جیسی کہ اسلام آباد کی۔(23)

اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ رشید اختر ندوی کی دلچسپی کا ایک ایسا عنوان ہے جس کی طرف نہایت سنجیدہ توجہ دینے کی شدید ضرورت ہے۔ میں نے اپنی گفتگو کے آغاز میں اقبال کے خطبہ الہٰ آباد کا ایک اقتباس پیش کیا تھا۔ جس میں اقبال کہتے ہیں کہ ایک سبق جو میں تاریخ اسلام سے سیکھا ہے، یہ ہے کہ آڑے وقتوں میں اسلام ہی نے مسلمانوں کی زندگی کو قائم رکھا، مسلمانوں نے اسلام کی حفاظت نہیں کی، رشید اختر ندوی کی اسلام فہمی اور مسلمانوں کی تاریخ نگاری کا مرکزی خیال قریب قریب یہی نکتہ بنتا ہے۔ اسلام اور مسلمانوں سے متعلق

اپنی جملہ تصانیف میں رشید اختر ندوی نے شعوری طور پر یہ کوشش کی ہے کہ اسلام اور مسلمان کے فرق کو ملحوظ رکھیں ۔ یعنی یہ کہ اسلام قبول کرنے والا ہر انسان مسلمان ہوتا ہے۔ لیکن ہر مسلمان کا ہر قول اور ہر فعل اسلام یا اسلامی نہیں ہوتا۔ اسلامی تاریخ کا سب سے بڑا المیہ یہ رہا ہے کہ ہر سرکش، فرماں روا، غاصب اور بعض اوقات عالم اپنی ذاتی اغراض، شخصی مصلحت و رجحان اور مفادات کو اسلام پر فوقیت دیتے اور پھر اپنے اس طرز فکر و عمل کو اسلامی قرار دینا شروع کر دیتے ۔ تاریخ میں ایسا بھی ہوا کہ بعض فرمان رواوں کے بہت سارے اعمال ، افعال اور اقدامات یا تو مال غنیمت کے لیے ہوتے تھے یا پھر کشور کشائی کے لیے، لیکن یہ سب ''اسلامی'' قرار دے کر ایک جذبے کے ساتھ وابستہ کر دیا جاتا۔ رشید اختر ندوی کے ہاں اس روش اور اس فرق کا احساس پایا جاتا ہے۔ وقیع تاریخی تصانیف 'مسلمان حکمران' مسلمان اندلس میں ، اس فرق کی غماز ہیں ۔ ساتھ ہی 'طلوع اسلام' اور تہذیب و تمدن اسلامی ' اسلام میں مرکزی حکومت کا تصور اور اس کی معاشی ذمہ داریاں ، خلافت راشدہ اور جمہوری قدریں اور سیرت کی نہایت جمیل کتاب محمد سرور دو عالم ﷺ سب اپنے موضوع کا واضح اور نہایت متعین اعلان کرتی ہیں ۔ اسلام میں ''مرکزی حکومت کا تصور اور اس معاشی ذمہ داریاں'' اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے رشید اختر ندوی کی بہترین تحقیقی تالیف ہے اور پاکستان میں اسلام اور اس کی توضیح و تعبیر کے حوالے سے ، اس کتاب کے مطالب حد درجہ اہمیت اختیار کر گئے ہیں۔

اس تالیف کو رشید اختر ندوی کی اسلام فہمی کو سمجھنے کی کلید خیال کرنا چاہیے ۔ چند نمایاں نکات قابل توجہ ہیں ۔ رشید اختر ندوی کے مطابق :

الف ۔ اسلام دنیا کی تمام تحریکوں، تنظیموں اور ادیان میں سے تنہا وہ تحریک تنہا وہ تنظیم اور تنہا وہ دین ہے جو انسانی معاشرے کو معاشرتی اور معاشی عدل و انصاف مہیا کرتا ہے۔

ب ۔ مگر یہ اسلام وہ نہیں جو بنو امیہ اور بنو عباس اور دوسرے بادشاہوں کے ذریعہ نئی نسلوں تک پہنچا ہے یہ وہ اسلام ہے جو حضور ﷺ اور حضور ﷺ کے خلفا راشدین کے اسوہ و مسلک سے عبارت ہے اور جس کی تشکیل حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت تک ہو چکی تھی۔

ج ۔ اسلام کے نزدیک کسی ایک ذات، کسی ایک فرد یا کسی ایک خاندان اور کسی ایک قبیلہ کا کوئی وزن نہیں ہے۔ اسلام کے نزدیک اگر کوئی چیز عزیز ہے تو وہ صرف عوامی فلاح اور عوامی مفاد ہے۔

د ۔ میرے نزدیک وہ علما اسلام کو بالکل نہیں سمجھتے جو اسلام میں عصبیت کا جواز تلاش کرتے اور نسلوں، قبیلوں اور مختلف قومیتوں کی گنجائش پیدا کرتے ہیں ۔(24)

رشید اختر ندوی کے نزدیک عوامی معاش اور اقتصاد کی مکمل ذمہ داری حکومت پر ہے اور اس ضمن میں وہ سرمایہ داری ، جاگیرداری اور دولت کے ارتکاز کو اسلام کے منافی خیال کرتے ہیں ۔ جاگیرداری یعنی حد سے بڑھی ہوئی ملکیت زمین کو وہ ایک فلاحی ریاست کے

مقاصد سے متصادم خیال کرتے تھے۔ رشید اختر ندوی ملکیت زمین کے مسئلے پر اس حد تک متوجہ تھے کہ ان کی تالیف اسلام میں مرکزی حکومت کا تصور اور اس کی اقتصادی ذمہ داریاں کا بیشتر حصہ اسی موضوع پر ہے۔ ایک اور تالیف 'مسلمان حکمران' میں بھی 'ملکیت زمین' کے زیر عنوان ایک باب قائم کیا گیا ہے، یہاں مجھے قیام پاکستان کے چند برس بعد، جبکہ آئین ساز اسمبلی میں جاگیرداری نظام کے بارے میں بحث ہو رہی تھی۔ لاہور سے ایک ممتاز عالم کا 'مسئلہ ملکیت زمین' کے عنوان سے شائع ہونے والا کتابچہ یاد آ رہا ہے۔ اس کتابچے میں فاضل مولف نے ملک کے ایک اہم سیاسی، معاشی اور سماجی مسئلے کو مذہبی مسئلہ بناتے ہوئے نہایت اعتماد سے قرار دیا تھا کہ :

> ۔۔۔۔۔ اسلام صرف یہی نہیں کہ زمین کی شخصی ملکیت کو جائز رکھتا ہے، بلکہ وہ اس ملکیت پر حد بھی نہیں لگاتا، اور مالک زمین کو یہ حق دیتا ہے کہ جس زمین کو وہ خود کاشت نہ کرتا ہو، اُسے وہ دوسرے کو مزارعت یا کرایہ پر دے دے۔(25)

وہ دن اور آج کا دن، ملک عزیز کے جملہ جاگیردار سیاست و ریاست میں برابر کے حصہ دار ہیں۔ نو آزاد ملک میں جاگیرداری پر پابندی تو نہ لگ سکی مگر آغاز ہی سے اس بات کا تعین ہو گیا کہ ملک میں اسلام کی توضیح و تعبیر کس نہج پر ہوا کرے گی۔ اس طرح گویا تصور و تحریک پاکستان کی مخالفت کرنے والے جملہ نیم مذہبی نیم سیاسی گروہوں نے نوازئیدہ پاکستان کا فکری نظم و نسق سنبھال لیا۔ ایسی صورت حال میں رشید اختر ندوی جیسے علما کی تحقیقات و توضیحات کے مطالعات کو تازہ کرنے کی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ میں نے ابھی رشید اختر ندوی کی فہم اسلام کے بارے میں چند نکات رقم کیے تھے۔ اسی تسلسل میں رشید اختر ندوی یہ بھی کہتے ہیں کہ :

> میرے نزدیک وہ علما بھی اسلام سے ناواقف ہیں جن کا خیال ہے کہ اسلام سرمایہ داری، جاگیرداری، تموّل اور دولت کے ارتکاز اور معاشی اونچ نیچ کو جائزہ سمجھتا ہے۔(26)

رشید اختر ندوی نے جس ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں، اس وقت فکر و نظر کے تین مختلف دھارے نظر آتے تھے، ایک نہایت قدیم اور تقلید پر مصر، دوسرا بے حد جدید اور مغرب زدگی کا شکار، لیکن اس دور میں متعدل فکر و نظر کا ایک وسط موجود تھا، یہ مڈل کلاس کے جدید تعلیم یافتہ نوجوان تھے، عامتہ الناس نے دونوں متحارب انتہاؤں کو رد کر کے اقبال اور جناح کا ساتھ دیا اور بامراد ہوئے۔ آج بھی ملک دو متحارب انتہاؤں کا شکار ہے۔ ایک طرف نام نہاد طالبانی اسلام ہے جس کے موقف کو ملک عزیز کی بعض مذہبی جماعتوں نے درست قرار دیتے ہوئے صرف طریقہ کار کے فرق کو اختلاف کا باعث قرار دے رکھا ہے۔ دوسری انتہا پر ہمارے مغربی خیر خواہوں کے تصورات و مطالبات ہیں جو ہمیں روشن خیال بناتے بناتے دیوار سے لگانے کے بعد، اب ہمیں دیوار میں چننے کی تیاری کر رہے ہیں۔ ایسے میں آج بھی ہمیں ایک وسط کی ضرورت ہے جو ہمیں دونوں انتہاؤں کی فکری دہشت گردی سے نجات دلا سکے۔ میرے نزدیک نظریاتی سطح پر اس دہشت گردی کا مقابلہ کرنے کے لیے رشید اختر ندوی جیسے مورخ اور دانشور کے مطالعات کو تازہ کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔

حواشی/حوالے

-1 محمد اکرام شیخ، موج کوثر (لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ایڈیشن بائیسواں، 2003ء) ص 7,6
شیخ محمد اکرام کا تجزیہ یہ ہے کہ تقسیم برصغیر سے پہلے (جدوجہد آزادی کے فیصلہ کن مرحلے پر) معتدل فکرونظر، رکھنے والے زعماء کا فقدان نہیں رہا۔ وہ اس ضمن میں شاہ ولی اللہ کا ذکر اس ضمن میں کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ بعدازاں اقبال بھی جس راستے پر چلا وہ عین شاہ ولی اللہ کے مطابق تھا۔

-2 محمد اقبال، خطبہ الہ آباد، اردو مترجم سید نذیر نیازی، مشمولہ، حرف اقبال، مرتبہ لطیف احمد خان شیروانی (اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، 1984ء) ص 50,49

-3 محمد اکرام شیخ، موج کوثر، ص 187
ندوۃ العلماء 1894ء کو لکھنو میں قائم ہوا۔ اس کے اساسی مقاصد حسب ذیل تھے۔
-1 نصاب تعلیم کی اصلاح، علوم دین کی ترقی، تہذیب و شائستگی اطوار
-2 علماء کے باہمی نزاع کا رفع اور اختلاقی مسائل کے ردو کد کا پورا انسداد
-3 عام مسلمانوں کی صلاح و فلاح اور اس کی تدابیر مگر سیاسی اور ملکی معاملات سے علیحدہ
-4 ایک عظیم الشاں اسلامی دارالعلوم کا قیام جس میں علوم و فنون کے علاوہ عملی صنایع کی بھی تعلیم ہو۔
-5 محکمہ افتا کا قیام

-4 رشید اختر ندوی، ساز شکستہ (لاہور: بیاض گروپ آف پبلی کیشنز، 2007ء) ص 5

-5 فہمیدہ بیگم، ڈاکٹر، مرتب، ڈاکٹر ذاکر حسین، شخصیت و معمار (نئی دہلی: ترقی اردو بیورو، اشاعت اول، 1995ء) ص 368,367,366,37,36

-6 زاہد نوید، رشید اختر ندوی، شخصیت اور فن (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، اشاعت اول، 1999ء) ص 13

-7 محمد اقبال، خطبہ صدارت آل انڈیا مسلم کانفرنس 1932ء مشمولہ: حرف اقبال، مرتبہ لطیف احمد خان شیروانی (اسلام آباد: علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، 1984ء) ص 65

-8 زاہد نوید، رشید اختر ندوی شخصیت اور فن، ص 16

-9 رشید اختر ندوی، صلاح الدین ایوبی (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2006ء) ص 7

-10 رشید اختر ندوی، مسلمان حکمران (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2009ء) ص 3

11- رشید اختر ندوی، اسلام میں مرکزی حکومت کا تصور اور اس کی معاشی اور اقتصادی ذمہ داریاں (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز 1986ء) ص3

12- رشید اختر ندوی، اورنگ زیب (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز 1955ء) ص12

13- رشید اختر ندوی، تہذیب وتمدن اسلامی، حصہ دوم، ہمارا تمدن عہد بنو عباس میں (لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، باردوم 1973ء) ص ح

14- فیض احمد فیض، دستِ تہ سنگ، نسخہ ہائے وفا (لاہور: مکتبہ کارواں، اشاعت چہارم 1985ء) ص308

15- فیض احمد فیض، میزان (کراچی: اردو اکیڈمی سندھ، باردوم 1965ء) ص212

16- 1941ء سے 1951ء تک رشید اختر ندوی کے حسب ذیل سترہ رومانی اور نفسیاتی ناول شائع ہوئے۔ سازِ شکستہ، نسرین، نشانِ راہ، کانٹوں کی سیج، گل رُخ، نشیمن، سودائی، تشنگی، ایک پہیلی، بادو باراں، یہ جہاں اور ہے، سوزِ دروں، تلخیاں، ہرجائی، پہلی کرن، پندرہ اگست، اس نے محبت کی

17- رشید اختر ندوی، تشنگی (لاہور: بیاض گروپ آف پبلی کیشنز، 2007ء) ص5

18- رشید اختر ندوی، تشنگی ص6

19- رشید اختر ندوی، تشنگی ص6

20- رشید اختر ندوی، الجھی راہیں (لاہور: نذیر سنز پبلی کیشنز، اشاعت اول 1990ء) ص5

21- یہ سات تاریخی ناول حسب ذیل ہیں: غرناطہ، سرنگا پٹم، یلغار، یروشلم وادی بلنسیہ (جنوبی اندلس)، مردکوہستان اور محمد بن ابی عامر

22- رشید اختر ندوی، شمالی پاکستان (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، 2002ء) ص12

23- رشید اختر ندوی، شمالی پاکستان، ص16

24- رشید اختر ندوی، اسلام میں مرکزی حکومت کا تصور اور اس کی معاشی اور اقتصادی ذمہ داریاں (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز 1986ء) ص6,5,4

25- مودودی، ابوالاعلیٰ، مسئلہ ملکیت زمین (لاہور: اسلامک پبلی کیشنز، اشاعت نہم 1994ء) ص26

26- رشید اختر ندوی، اسلام میں مرکزی حکومت کا تصور، ص6

رشید اختر ندوی، رومان، تاریخ اور تحقیق

ڈاکٹر شاہد اقبال کامران

بیسویں صدی کی دوسری دہائی سے لیکر آخری دہائی تک کا دور برصغیر میں بسنے والے مسلمانوں کے لیے متعدد وجوہ کی بنا پر بڑی اہمیت رکھتا ہے اور اس میں سے بھی نصف اول، کہ جس میں مسلمانان برصغیر کو اپنے جداگانہ تشخص کے تحفظ کے لیے ایک خاص سیاسی موقف تک پہنچتے ہوئے فیصلہ کن جدوجہد کرنا پڑی، حد درجہ محتاط مطالعے اور تجزیے کا متقاضی ہے۔ یہی دور پاکستان کے ممتاز دانشور، اردو کے محبوب ناول نگار، منفرد مورخ، مفکر، سوانح نگار اور مترجم رشید اختر ندوی کا عرصہ حیات بھی ہے (1913ء۔1992ء) جس سیاسی، مذہبی معاشی اور معاشرتی ماحول میں رشید اختر ندوی نے آنکھیں کھولیں، وہ فکر و نظر کے تین واضح دھاروں میں منقسم تھا۔ ایک نہایت قدیم اور تبدیل شدہ صورت حال اور اس کے اثرات کو قبول کرنے سے بے زار، دوسرا تبدیل شدہ صورتحال کی تخلیق اور خود کو بدلتے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے بے چین۔ ایک دوسرے سے یکساں بے زاری اور نظریاتی بُعد ان دونوں طبقات کی واحد قدر مشترک تھی۔ تیسرا طبقہ ''متعدل فکر و نظر'' رکھتا تھا۔ معتدل فکر و نظر کی ترکیب مولانا ابوالکلام آزاد نے ترکی کی صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے وضع کی تھی اور شیخ محمد اکرام نے 'موج کوثر' میں اسے حوالہ بنایا ہے۔(1) درا صل اس سے ایسا رجحان مراد ہے جو نہ تو نہایت قدیم کی طرح تقلید کا شکار ہو اور نہ ہی نہایت جدید کی طرح مغرب زدگی کا شکار، اس رجحان کا حاصل یہ شعور ہے کہ اپنی دینی اساس سے وابستہ رہتے ہوئے بھی جدید تغیرات کی خوبیاں اپنائی جاسکتی ہیں نیز یہ کہ علم کا کوئی مذہب اور کوئی مخصوص زبان نہیں ہوتی ہاں البتہ جن مذاہب کے ماننے والے علم سے دور ہو جائیں وہ عملاً زندگی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ ہماری تاریخ کے اس فیصلہ کن دور میں، مقام شکر ہے کہ عامتہ الناس نے دو نظریاتی انتہاؤں کے درمیان وسط اور اعتدال کے موقف کو پذیرائی بخشی۔ بیسویں صدی کی تیسری دہائی کے اواخر میں رشید اختر ندوۃ العلماء لکھنو میں زیر تعلیم تھے، ملک میں سیاسی حالات و واقعات کی رفتار تیز سے تیز تر ہو رہی تھی، گول میز کانفرنسوں کا سلسلہ شروع ہوا تھا اور ادھر الہٰ آباد میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں خطبہ صدارت دیتے ہوئے اقبال اپنے وقیع استدلال کو یوں سمیٹ رہے تھے کہ:

> ہندوستان کی سیاسی غلامی تمام ایشیا کے لیے لامتناہی مصائب کا سرچشمہ ہے اس نے مشرق کی روح کو کچل ڈالا ہے اور اسے اظہار ذات کی اس مسرت سے محروم کر دیا ہے جس کی بدولت کبھی اس میں ایک بلند اور شان دار تمدن پیدا ہوا تھا...... مادیات سے گزر کر روحانیات میں قدم رکھیے۔ مادہ کثرت ہے لیکن روح نور ہے، حیات ہے، وحدت ہے ایک سبق جو میں نے تاریخ اسلام سے سیکھا ہے، یہ ہے کہ آڑے وقتوں میں اسلام ہی نے مسلمانوں کی زندگی کو قائم رکھا، مسلمانوں نے اسلام کی حفاظت نہیں کی۔ اگر آج آپ اپنی نگاہیں